بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

دورِ جدید میں مادہ پرستانہ فلسفۂ حیات نے لوگوں کے فکر و نگاہ کے زاویوں کو جس انداز سے بدلا ہے اس سے نہ صرف بعض الفاظ اور محاورات کے مفہوم بدل گئے ہیں بلکہ ان کی اہمیت کے مدارج اور ان کے مطالب و معانی کے دائروں میں بھی اچھا خاصہ تغیر رونما ہوا ہے۔ چنانچہ روزمرہ کے وہ الفاظ جو اپنے اندر کوئی خاص معنویت نہ رکھتے تھے وہ اب اس بنا پر اصطلاحات کا روپ دھارنے لگے ہیں کہ ان میں مادی فلسفۂ حیات کی روح کارفرما نظر آتی ہے، یا اُن الفاظ کی اہمیت بڑھنے لگی ہے جو کسی اعتبار سے مادی اندازِ فکر کے ترجمان دکھائی دیتے ہیں، یا عام الفاظ میں بالکل مصنوعی طریق سے مادیت کا رنگ بھرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ ہمارے اس دور میں وہ الفاظ جنہیں مادی نقطۂ نظر کی وجہ سے اصطلاحات کا درجہ حاصل ہوا ہے ان میں سماج، طبقہ، کشمکش، حقوق، محنت کش، سرمایہ داری اور اسی نوع کے دیگر الفاظ شامل ہیں۔ دوسرے زمرے میں تجربہ، مشاہدہ، عقل، آفاق جیسے متعدد الفاظ آتے ہیں۔ وہ الفاظ جنہیں کھینچ تان کر مادی اندازِ فکر کا ترجمان بنایا جارہا ہے ان کی فہرست سب سے طویل ہے۔ ظلم، استبداد، مساوات، استحصال اور اسی نوع کے لاتعداد الفاظ ایسے ہیں جن کے سُنتے ہی انسان کے ذہن میں مادی تصورات گھومنے لگتے ہیں۔ مثلاً آج ہم جب لفظ "ظلم" سنتے ہیں تو ہمارے ذہن میں یہی ایک خیال اُبھرتا ہے کہ کسی فرد یا گروہ کے ساتھ تقسیمِ دولت کے معاملہ میں ظلم ہورہا ہے، درآنحالیکہ ظلم کی بے شمار صورتیں ہیں اور وہ اس معاشی ظلم سے کہیں زیادہ روح فرسا ہوتی ہیں۔ مادی افکار کی یلغار نے ان الفاظ کا اس طرح حلیہ بگاڑا ہے کہ بسا اوقات خالص روحانی اور پاکیزہ اصطلاحات بھی صرف معیشت اور مادیت کی شارح و ترجمان نظر آتی ہیں۔ مثلاً آپ "مساواتِ محمدیؐ" کے نعرہ کو لیں اور دیانتداری سے غور کریں کہ کیا اس نعرہ کو سُن کر انسان کے ذہن میں صرف یہی ایک تصور نہیں اُبھرتا کہ کسی معاشرہ میں معاشی اعتبار سے جو اُونچ نیچ پائی جاتی ہے، وہ ختم ہو اور مساواتِ شکم کی بنیاد پر اس معاشرے کی تعمیرِ نو

کی جائے ؟ انسانوں کے مابین مساویانہ اور عادلانہ برتاؤ صرف زندگی کے ایک شعبہ ہی میں درکار نہیں ہوتا بلکہ انسان زندگی کے ہر شعبہ میں اِس سلوک کا اپنے آپ کو مستحق سمجھتا ہے لیکن ماہرینِ فن نے اس اصطلاح میں مادیت کے ایسے شوخ رنگ بھر دیے ہیں کہ ایک انسان کو یہ اصطلاح "مساواتِ شکم" کے ہم معنی دکھائی دیتی ہے۔

اِسی طرح آپ "نظام ربوبیت" پر غور کریں۔ یہ اصطلاح اپنے مزاج کے اعتبار سے ایک دینی اصطلاح ہے اور اسے سُن کر کسی سلیم الفطرت انسان کے ذہن میں اسلامی نظام کا نقش ہی اجاگر ہوتا ہے کیونکہ کائنات کے خالق نے انسان کی ساری احتیاجات کا بطریقِ اَحسن انتظام کر رکھا ہے۔ اُس ذات نے ایک طرف اگر انسان کی مادی احتیاجات کی تسکین کے لیے ذرائع و وسائل مہیا کیے اور ضابطے مقرر فرمائے ہیں تو دوسری طرف انسان کی روحانی پیاس بُجھانے اور اُس کے اخلاقی احساسات کو زندہ رکھنے کا بھی پورا پورا التزام کیا ہے لیکن مادی فلسفہِ حیات خصوصاً اشتراکیت کے زیرِ اثر اس مقدس اصطلاح کو اس طرح بگاڑا گیا ہے کہ اسے سُنتے ہی انسان کے ذہن میں ایک ایسے نظام کا تصور آتا ہے جس میں انسانوں کا ایک محدود سا گروہ مرکزِ ملت کے نام پر نہ صرف کسی ملک کے وسائلِ رزق پر قابض ہو، بلکہ اس کے سیاہ و سفید کا بھی پوری طرح مالک ہو اور پھر وہ اپنی صوابدید کے مطابق عوام کو روٹی کے نوالے تقسیم کرے۔ کیا اس اصطلاح کے پردے میں اشتمالیت کا پرچار نہیں کیا جا رہا ؟ یہ اصطلاح جب جدید مفہوم کے ساتھ سامنے آتی ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ اسے غالباً وضع ہی اس غرض کے لیے کیا گیا ہے کہ دنیا کو یہ باور کرایا جائے کہ کسی ملک کے وسائلِ معیشت پر حکومت کی مکمل اجارہ داری صرف اشتراکیت کا ہی طرۂ امتیاز نہیں بلکہ اسلام بھی اسی قسم کے جابرانہ نظام کا علمبردار ہے۔

ان اصطلاحات کے علاوہ بعض الفاظ کو مادیت کے پسِ منظر میں رکھ کر ایسے نئے مفاہیم کے ساتھ سامنے لایا جا رہا ہے کہ ان کے اور مادی پس منظر کے مابین پوری طرح مطابقت نظر آئے۔ اِس نوعیت کی علمی عیاری کی یوں تو متعدد مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں مگر ان صفحات میں ہم صرف ایک لفظ "تجربہ" کو لیتے ہیں۔ یہ لفظ بظاہر کس قدر سادہ اور مفہوم کے لحاظ سے کس قدر آسان ہے لیکن مادی فلسفہِ حیات نے اس لفظ کے مفہوم اور مدعا کو جس انداز سے تبدیل کیا ہے اور پھر اس معصوم سے لفظ کی آڑ میں انسانیت کو جن ہولناکیوں سے دوچار کیا ہے

اس کے تصور سے انسانی رُوح لرز جاتی ہے۔

لفظ تجربہ جب کسی شخص کی زبان سے ادا ہوتا ہے تو یہی ایک مفہوم سامنے آتا ہے کہ کوئی ایسا کام جس سے کسی چیز کی ماہیت، یا اس کا اصول یا اثر معلوم کیا جا سکے یا کسی شے کی آزمائش، جانچ اور پرکھ کرنے کا طریقہ۔ اس لفظ کو دَورِ جدید سے پہلے کبھی وحی کا نقیض تصور نہیں کیا گیا تھا بلکہ اسے وحی کے ذریعے حاصل ہونے والی معلومات کی صحت منکرینِ وحی پر ثابت کرنے کا مؤثر طریقہ سمجھا گیا ہے مگر آج مادیت کے علمبردار دانشوروں کی کاوشوں کی وجہ سے یہ لفظ وحی اور الہام کی ضد بن کر رہ گیا ہے اور انسان اس نہج پر سوچنے لگا ہے کہ تجربہ اور مشاہدہ ہی علمِ حقیقی کی اساس ہیں اور جو معلومات تجربہ اور مشاہدہ کے ذریعہ انسان کو حاصل نہ ہوں وہ محض اوہام ہیں۔

آگے بڑھنے سے پیشتر اس بات کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ آخر اس لفظ کو آجکل کے مادی دور میں غیر معمولی اہمیت کیوں حاصل ہوئی ہے۔ یوں تو اس کے متعدد وجوہ ہیں جن میں بعض تاریخی عوامل بھی شامل ہیں لیکن اس ضمن میں دو وجوہ خاص طور پر نمایاں ہیں۔

انسان اپنی صلاحیتوں اور قوتوں کے اعتبار سے ایک محدود اور حقیر سی ہستی ہے لیکن اس کے اندر جو امنگیں اُبھرتی ہیں وہ لامحدود ہوتی ہیں اور ان کی وجہ بھی غالباً یہی ہے کہ انسان محدود قوتوں اور محدود ذرائع کے باوجود لامحدود کو سمجھنے اور اس سے تعلقِ خاطر پیدا کرنے کی شدید آرزو رکھتا ہے۔ اس کی اس بے بسی کو قدرت نے وحی کے ذریعہ دور کیا ہے تاکہ وہ اپنی ساری حد بندیوں اور مجبوریوں کے علی الرغم ایک ایسی راہ پر گامزن ہو سکے جس سے اسے نہ صرف لامحدود کا شعور حاصل ہو بلکہ اس کے ساتھ رشتہ عبودیت بھی استوار کر سکے۔

قدرت کی یہ معاونت صرف فکر و جذبہ تک ہی محدود نہیں بلکہ اس نے زندگی کے عملی میدان میں بھی انسان کی اس احتیاج کو بطریقِ احسن پورا کیا ہے۔ جس خالق نے انسان کی تخلیق کی ہے اسے اپنی اس مخلوق کی فطری حد بندیوں اور مجبوریوں کا پورا علم ہے۔ وہ اس حقیقت سے اچھی طرح آگاہ ہے کہ اگر انسان کو زندگی کی اس رزم گاہ میں

صرف عقل کے سہارے پر چھوڑ دیا جائے تو اسے زندہ رہنے کے لیے کیا کیا دشواریاں اور مشکلات پیش آئیں گی اور اس کی زندگی کس خوفناک عذاب کی صورت میں اُس پر مسلط ہوگی - اس بنا پر اُس ذات نے نبوت کی شکل میں انسان کو ایک ایسی روشنی عطا کی ہے جو اسے نہ صرف تاریکی میں بھٹکنے اور اندھیروں میں ٹامک ٹوئیاں مارنے سے محفوظ رکھتی ہے بلکہ حق وصداقت کی صاف اور روشن راہ پر گامزن رہنے کی ترغیب بھی دیتی ہے۔ قرآن مجید نے متعدد مقامات پر اپنے مخصوص بلیغانہ انداز میں نبوت کو رحمتِ الٰہی سے تعبیر کیا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ نظر آتی ہے کہ اُس ذات نے اپنے خاص مصالح کے تحت انسان کو علم کے جو مختلف ذرائع عطا کیے ہیں وہ چونکہ محدود ہونے کی وجہ سے اشیاء اور اعمال کے روحانی اور اخلاقی پہلوؤں کا پوری طرح احاطہ نہیں کر سکتے اس لیے انسان کی اس فطری کمزوری کو وحی کے ذریعے دُور کیا گیا ہے تاکہ اسے کسی نظریہ یا عمل کی صحت جانچنے کے لیے ہولناک تجربات سے گذرنا نہ پڑے بلکہ وحی اس کی ہر قدم پر رہنمائی کرے۔ دورِ حاضر کے ایک نامور مفکر نے وحی کے اس پہلو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس ذریعۂ علم کو "انسانی تجربہ کی کفایت" سے تعبیر کیا ہے۔

اب اگر کوئی فلسفۂ حیات اپنے سامنے یہ مقصد رکھتا ہے کہ انسان کو وحی سے بدظن کیا جائے تو اس کی سب سے زیادہ آسان صورت یہ ہے کہ وحی کے مقابلہ میں تجربہ اور مشاہدہ کی اہمیت کو غیر معمولی طور پر بڑھایا جائے اور اس کے ذہن میں یہ باطل خیال راسخ کیا جائے کہ جس چیز کی تائید تجربہ سے نہیں ہوتی وہ باطل ہے کیونکہ اگر وہ صحیح ہے تو اُس کی تائید تجربہ سے ہر حال میں ہونی چاہیے - یہ وہ مقام ہے جہاں نوعِ انسانی کی سیاہ بختی کا آغاز ہوتا ہے۔ تجربہ کی بنیاد حواسِ خمسہ پر ہے اور انسان کے یہ حواس اشیاء اور اعمال کے صرف مادی خواص کا ہی کسی قدر اندازہ کر سکتے ہیں اس لیے تجربہ سے انسان کو جو معلومات حاصل ہیں وہ مادی اعتبار سے خواہ کتنی ہی مفید اور نتیجہ خیز ہوں مگر روحانی اور اخلاقی نقطۂ نظر سے کسی قدر وقیمت کی حامل نہیں ہو سکتیں۔ انسان کا جسم بلاشبہ بعض مادی عناصر سے عبارت ہے لیکن اس میں انسانیت کا اصل جوہر جس کی بنا پر اسے "اشرف المخلوقات" قرار دیا گیا ہے وہ اس کا روحانی احساس ہے۔ چنانچہ جب ہم تجربہ کو انسانی علم کی واحد بنیاد قرار دیتے ہیں تو ہم درحقیقت اس کے اخلاقی اور روحانی جوہر کا ابطال کرتے ہیں اور اس کے بارے میں یہ غلط نتیجہ اخذ کرتے ہیں وہ کائنات کی مادی قوتوں کے ہاتھ میں بے بس کھلونا ہے یا زیادہ صحیح الفاظ میں معاشی قوتیں ہی اس کے فکر و احساس کا ہیولیٰ تیار کرتی ہیں۔ تجربہ چونکہ وحی والہام اور انسان کے اخلاقی اور روحانی احساس کی نفی

کے لیے ایک کارگر ہتھیار کے طور پر استعمال ہوسکتا ہے، اس لیے مادی فلسفۂ حیات کے پرستاروں نے اس لفظ کو خوب اچھالا ہے اور ایک مخصوص دائرے اور خاص حد کے اندر جو عمل خاصا مفید اور کارآمد ثابت ہوسکتا تھا اُسے اُس کی فطری حدود سے نکال کر انسانیت کی تباہی کا ذریعہ بنا یا گیا ہے۔

انسان کی اس سے زیادہ بدقسمتی اور کیا ہوسکتی ہے کہ اسے زندگی کے سارے دائروں میں ایک ایسے ہتھیار سے کام لینے پر مجبور کیا جائے جو اس کے لیے کسی ایک شعبہ میں بھی پوری طرح کارگر ثابت نہیں ہوسکتا۔ لیکن اس ہتھیار کے بے محابہ استعمال نے زندگی کے اندر جس قسم کی پیچیدگیاں پیدا کی ہیں اُن کا اندازہ مندرجۂ ذیل مثال سے لگایا جاسکتا ہے۔

حیاتِ انسانی کا وہ گوشہ جس میں تجربہ کا ہتھیار سب سے زیادہ مؤثر ثابت ہوتا ہے وہ پیدائشِ دولت کا شعبہ۔ کیونکہ اسی ہتھیار کی مدد سے ہی انسان طریقِ پیدائش کی نئی نئی گرہیں کھولنے میں کامیاب ہوا ہے اور جس کے نتیجے میں کثیر پیداواری اور زود پیداواری ممکن ہوئی ہے مگر انسان کی اس محیر العقول کامیابی نے اُس کے لیے بے لاینحل مسائل پیدا کر دیے ہیں جس نے اس کی زندگی کو جہنم کا نمونہ بنا کر رکھ دیا ہے۔ یہ اسی افزائشِ دولت کا نتیجہ ہے کہ صنعتی اعتبار سے طاقتور قوموں نے کمزور ممالک کو غلام بنا کر نہ صرف ان کے باشندوں کے خون سے ہاتھ رنگے ہیں بلکہ ان کے وسائل کو بھی بے دریغ لوٹا ہے۔ پھر دولت پرستی کے اس جنون نے جارحانہ قوم پرستی، نسل پرستی، آمریت، اشتراکیت اور اشتمالیت جیسے ظالمانہ نظاموں کو انسانوں پر مسلط کر کے ان کی انسانیت کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا ہے، الفاظ کا کوئی ڈھانچہ اس دردناک حزنیہ کے اظہار کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ یہ ان غلط نظریات کے تلخ ثمرات ہیں کہ انسان دور دراز فاصلوں کے سمٹ جانے کے باوجود نہ صرف ایک دوسرے سے بعد و بیگانگی رکھتے ہیں بلکہ ایک دوسرے کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کے درپے ہیں۔ انسان کو مال و دولت کی جو فراوانی نصیب ہوئی ہے اُس کے پیشِ نظر اس بات کی بجا طور پر توقع کی جاسکتی تھی کہ دولت کی یہ ریل پیل اُس کے لیے بہتر اور شاد کام زندگی کی ضمانت ثابت ہوگی مگر یہ اُلٹی اُس کے لیے ان گنت اور ناقابلِ برداشت مصائب کا باعث بن رہا ہے۔ اس کی وجہ اس کے علاوہ اور کیا ہے کہ جس تجربہ سے انسان نے افزائشِ دولت کے ڈھنگ سیکھے ہیں وہ اس کی اخلاقی اور روحانی نشوونما کرنے میں ناکام رہا ہے۔ پھر اس معاملہ میں اس کی بے بسی اور مجبوری بھی ظاہر ہے۔ تجربہ کی جولانگاہ صرف مادی دنیا ہے اور جو چیز اس دائرے میں نہیں آتی وہ تجربہ کی دسترس سے بھی باہر ہے

اور اگر اِس معاملہ میں اُس پر انحصار کیا جائے تو انسان کی تباہی یقینی ہے۔ بقول ابن خلدون جو ترازو سونا تولنے کے لیے بنایا گیا ہے اسے اگر پہاڑوں کو تولنے کے لیے استعمال کیا جائے تو اس ترازو اور ان غلط عزائم کے حامل لوگوں کا جو حشر ہوگا اس کا اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں۔

"تجربہ" پر بے جا اعتماد کا دوسرا خوفناک پہلو جو انسانیت کے لیے مندرجہ بالا پہلو سے بھی کہیں زیادہ المناک اور تباہ کن ثابت ہوا ہے وہ معاشرتی زندگی میں اس کی عملداری ہے۔ دورِ جدید کا سائنسدان اپنی تجربہ گاہ میں اس بات کا پورا التزام کرتا ہے کہ کوئی جاندار شے تو کجا کسی بے جان شے کا بھی زیاں نہ ہو۔ وہ کم سے کم اشیاء کے استعمال سے بہتر سے بہتر نتائج حاصل کرنے کی تدابیر سوچتا ہے تاکہ اس کی محنت پوری طرح بارآور ہو۔ پھر اگر وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ کسی جاندار پر تجربہ کیے بغیر وہ کوئی مفید نتائج اخذ نہیں کرسکتا تو وہ حقیر سے جانوروں پر تجربات کرتا ہے لیکن اپنے کسی تجربہ کے لیے انسان پر مشقِ ناز کرنے سے حتی المقدور گریز کرتا ہے۔ اسے جب دوسرے تمام ذرائع سے اپنے تجربے کی صحت کے بارے میں مکمل اطمینان ہو جاتا ہے اور وہ اس بات کا یقین کرلیتا ہے کہ اُسے اِس تجربے کی وساطت سے جو معلومات حاصل ہوئی ہیں وہ انسان کے لیے کسی لحاظ سے مہلک ثابت نہ ہوں گی، اُس وقت وہ اپنی اِن تحقیقات کے نتائج سے انسانوں کو بڑی احتیاط کے ساتھ بہرہ ور کرتا ہے۔ مگر یہ عجیب بات ہے کہ تجربات کا دلدادہ انسان جب علوم طبیعی کے معمل سے نکل کر زندگی کی معاشرتی، سیاسی اور معاشی تجربہ گاہوں میں سرگرم عمل ہوتا ہے تو نوع بشری کے بارے میں اس حزم و احتیاط کو یکسر نظر انداز کر کے ایسا عاجلانہ اور غیر ذمہ دارانہ بلکہ انسانیت کش رویہ اختیار کرتا ہے جس سے نسلِ انسانی نہایت خوفناک قسم کی ہلاکت خیزیوں سے دوچار ہوتی ہے۔ عقل و دانش کے یہ جاں نثار فہم و فراست کے اونچے دعووں کے باوجود ابھی تک اس حقیقت کو سمجھ نہیں پائے کہ معاشرتی زندگی کے تجربات بڑے طویل اور صبر آزما ہوتے ہیں اور یہ تجربات اگر ناکام ہو جائیں تو انسانیت پر قیامت ٹوٹ پڑتی ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو ان تجربات کی آزمائش میں نہیں ڈالا۔ ہم یہاں اپنی بات کی وضاحت دو تین مثالوں سے کرتے ہیں۔

آپ ایک ثانیہ کے لیے معاشرتی تجربات کے اثرات کو نظر انداز کرتے ہوئے صرف اُن طبی اور سائنسی

تجربات کی ناکامیوں کے بے پناہ نقصانات پر غور کریں جن سے انسان کسی نہ کسی صورت میں متاثر ہوتا ہے اور پھر اس امر کا اندازہ لگائیں کہ ایک معمولی لغزش انسانیت کے لیے کس حد تک تباہ کن ثابت ہوئی ہے۔ ابھی حال ہی میں پاکستان کے اندر ادویہ کے نوعی اسمار کا تجربہ ناکام ہوا ہے۔ یہ تجربہ اگرچہ انسانی زندگی کے لیے بڑی اہمیت رکھتا ہے لیکن اُسے صحیح معنوں میں کوئی معاشرتی تجربہ نہیں کہا جا سکتا۔ اس کا تعلق علم کے اُس شعبے سے ہے جس کے نتائج ظاہر ہونے میں کوئی زیادہ دیر نہیں لگتی اور جو معاشرے کے ہر فرد کو بیک وقت اپنی لپیٹ میں نہیں لیتا لیکن اس کے باوجود اس تجربے کی ناکامی سے نہ صرف کروڑوں روپے کا نقصان ہوا ہے بلکہ لاکھوں انسانوں کے لیے کسی نہ کسی صورت میں ضرر رساں ثابت ہوا ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ اس سے ہزاروں جانیں بھی ضائع ہوئی ہیں تو یہ کسی طرح بھی مبالغہ نہ ہوگا۔

اگر صرف ایک ملک کے شعبہ طب کا ایک معمولی سا تجربہ ناکام ہو کر اس ملک کے باشندوں کے لیے بہت بڑی بربادی کا باعث بن سکتا ہے تو معاشرتی تجربات جن کے نتائج صدیوں کے بعد کھل کر سامنے آتے ہیں اور جن سے معاشرے کے ہر فرد کی زندگی متاثر ہوتی ہے، ان کی تباہ کاریوں کا کس طرح صحیح طور پر اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ آپ مثال کے طور پر قومی ملکیت کے تجربے کو ہی لیجیے۔ معاشرتی زندگی اور اس کے مسائل سے دلچسپی رکھنے والے بعض مفکرین نے بے کسوں کو استحصال سے محفوظ رکھنے کے لیے یہ فلسفہ پیش کیا کہ کسی معاشرہ میں فساد کی جڑ نجی ملکیت کا وجود ہے اس لیے اس بُرائی کو مٹانے کا واحد راستہ یہ ہے کہ ملک کی ساری املاک اور تمام وسائل رزق حکومت کی تحویل میں دے دیے جائیں اور اسے یہ اختیار حاصل ہو کہ وہ جس طرح چاہے عوام کو زندہ رکھنے کا سامان کرے۔ چنانچہ اس فلسفہ کی عملی افادیت اور قومی ملکیت کی محسوس برکات کا اندازہ کرنے کے لیے روس سے اس تجربے کا آغاز کیا گیا۔ ظاہر ہے یہ ملک دوسرے ممالک کی طرح ایسے انسانوں سے آباد تھا جو اپنے مخصوص عقائد اور افکار رکھتے تھے، جن کے دنیوی اور اُخروی زندگی کے بارے میں خاص نظریات تھے، جن کی روایات اُن کے رگ و پے میں سرایت کیے ہوئی تھیں اور جو ان عقائد اور روایات کے زیر اثر ملکیت کے بارے میں اپنے ایک الگ نقطہ نظر اور احساس کے حامل تھے۔ اس بنا پر روس کو اشتراکیت کی تجربہ گاہ بنانا کوئی آسان کام نہ تھا۔ اِس کے لیے بڑے وسیع پیمانے پر توڑ پھوڑ اور شدید نوعیت کے جبر و استبداد کی ضرورت تھی۔ چنانچہ اشتراکیت کے علمبرداروں نے لاکھوں افراد کے قتل، اور کروڑوں (باقی بر صفحہ ۴۶)